(28)

رمضان کے بابرکت مہینہ کے فیوض سے فائدہ حاصل کریں

(فرمودہ 19 ستمبر 1941ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

''چونکہ عنقریب رمضان شریف کا مہینہ شروع ہونے والا ہے اس لئے سب سے پہلے میں دوستوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ جہاں تک ہو سکے اس بابرکت مہینہ کے فیوض سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ میرے نزدیک قرآن کریم کی یہ آیت کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ 1 اس مہینہ کی برکات اور اس کے فیوض کو ایسا واضح کرتی ہے کہ انسان کے دل میں اس کی اہمیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے جس مہینہ کا اللہ تعالیٰ نے اس بات کے لئے انتخاب فرمایا ہو کہ ابتدائے قرآن اس میں نازل ہو اور جس میں جبریل اس وقت تک کے نازل شدہ قرآن کو ہمیشہ دہراتے رہتے ہوں۔2 اس مہینہ کے بارہ میں مومنوں کے دلوں میں جتنا جوش پیدا ہو اور جتنی قرآن کریم کی تلاوت اس مہینہ میں کی جائے کم ہے خدا تعالیٰ کا یہ فعل اور جبریل کا نزول اور رسول کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا اس کے ساتھ تلاوت فرمانا بتلاتا ہے کہ رمضان کا تعلق صرف روزوں سے ہی نہیں بلکہ قرآن کریم کی تلاوت، اُس پر غور و خوض اور اُس کے معانی پر تدبر کرنا بھی روزوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے ضروری امور میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قادیان میں رمضان کے موقع پر درس القرآن کا انتظام کیا جاتا ہے۔ جب میری طبیعت اچھی ہوا کرتی تھی تو مَیں درس دیا کرتا تھا مگر اب جبکہ میری صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ بعض اور علماء سے درس دلایا جاتا ہے اور قادیان کے مخلصین اس میں شامل ہوتے ہیں اور جو لوگ شامل نہیں ہوتے

وہ کم سے کم درس قرآن کی جو قضاء عمری ہوتی ہے اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں عام رواج ہے کہ وہ سارا سال نمازیں نہیں پڑھتے یا کم سے کم باقاعدگی اور التزام کے ساتھ نہیں پڑھتے مگر رمضان کے آخری جمعہ میں شامل ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قضاء عمری ہو گئی۔ اس دن وہ کچھ زائد نفل پڑھ لیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ان نمازوں کے بدلہ میں جو اُن سے چھوٹ گئی تھیں وہ نفل کافی ہوگئے ہیں۔ اسی طرح جو غافل اور سست لوگ سارا مہینہ درس میں شامل نہیں ہوتے وہ قرآن کریم کی آخری ایک دو سورتوں کے اس درس میں جو مجھ سے دلوایا جاتا ہے اور آخری دعا میں شامل ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ درس کی قضائے عمری ہو گئی۔ گو نہ نمازوں کی قضائے عمری ہوتی ہے اور نہ درس کی۔ بہرحال ایک ایسا شخص جسے اس بات کی اہلیت نہیں کہ وہ ذاتی طور پر قرآن کریم کے مطالب کو سمجھ سکے اسے اگر سارے سال میں چند دن ایسے میسر آ جائیں جن میں اسے تمام قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر سننے کا موقع مل جائے اور پھر بھی وہ اس میں حصہ نہ لے تو اس سے زیادہ بدبخت اور کون ہو سکتا ہے۔

یوں انسان محبت کے بڑے بڑے دعوے کیا کرتا ہے لیکن سوال صرف دعووں کا نہیں بلکہ عمل کا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن کریم سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے اپنے عمل سے اس محبت کا ثبوت بھی دینا چاہئے۔ مگر عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ محبت کے صرف زبانی دعووں پر اکتفا کی جاتی ہے اور عملی رنگ میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاتا۔ حضرت خلیفہؓ اول کی مثال مجھے ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے قرآن پڑھا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اَن پڑھ ہیں ہمیں قرآن پڑھنا نہیں آتا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ یہ دلیل میری سمجھ میں کبھی نہیں آتی کہ اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے ایک شخص قرآن کریم کے سمجھنے سے کس طرح بری الذمہ ہو سکتا ہے۔ آپ فرماتے تھے دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی کے پاس اپنے کسی عزیز کا خط آتا ہے

تو جو شخص پڑھا ہوا ہوتا ہے وہ تو ایک دفعہ خط کو پڑھ کر رکھ دیتا ہے مگر اَن پڑھ جب تک پانچ سات دفعہ وہ خط لوگوں سے پڑھا نہ لے اسے تسلی نہیں ہوتی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر بیٹی یا بھائی یا بیوی یا خاوند یا باپ یا ماں کی خیریت کا خط آنے پر پڑھوں اور اَن پڑھوں میں یہ فرق نظر آتا ہے کہ پڑھا ہوا شخص تو خط کو ایک دفعہ پڑھ کر مطمئن ہو جاتا ہے مگر اَن پڑھ جب تک چار پانچ متفرق لوگوں سے خط نہ پڑھا لے اسے تسلی نہیں ہوتی کیونکہ وہ خیال کرتا ہے کہ شاید ایک شخص سے کوئی بات رہ گئی ہو۔ اس لئے جب وہ ایک سے خط کا مضمون سن لیتا ہے تو دوسرے کے پاس جاتاہے اور دوسرے کے بعد تیسرے اور پھر چوتھے اور پانچویں کے پاس۔ تو اسی طرح اگر لوگوں کو خدا تعالیٰ سے بھی سچی محبت ہوتی تو قرآن کریم کے مطالب کو سمجھنے کے لئے اَن پڑھ پڑھے ہوئے لوگوں سے زیادہ بیقرار ہوتے اور وہ کئی کئی بار لوگوں سے اس کو سن چکے ہوتے۔

یہ ایک نہایت ہی معرفت کا نکتہ ہے جس میں انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ نظر آتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارا اپنا تجربہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اَن پڑھ اپنی جیب میں ایسے خط رکھ لیتے ہیں اور جہاں انہیں اپنا کوئی ایسا دوست نظر آتا ہے جو پڑھا لکھا ہو یا کسی اور شخص کو دیکھتے ہیں جو گو ان کا دوست نہ ہو مگر نرم طبیعت کا ہو اور وہ سمجھتے ہوں کہ یہ خط پڑھنے سے انکار نہیں کرے گا تو اس کے سامنے وہ خط پیش کر کے کہتے ہیں کہ ذرا اسے پڑھ کر سنا دیں۔ پھر اس پر بھی ان کی تسلی نہیں ہوتی اور وہ اوروں سے پڑھواتے ہیں۔ یہاں تک کہ آٹھ دس متفرق آدمیوں سے خطوط سن سن کر ان کا مضمون انہیں حفظ ہو جاتا ہے۔ تو اَن پڑھ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایسا شخص قرآن پڑھنے یا سننے سے آزاد ہے۔ بلکہ اَن پڑھوں کو زیادہ فکر سے قرآن کریم کو بار بار سننا چاہئے کیونکہ ممکن ہے وہ ایک سے قرآن کریم سنیں اور وہ بعض آیات کا انہیں غلط مطلب بتا دے۔ جس طرح اَن پڑھ پہلے ایک شخص سے خط پڑھواتا ہے تو اس سے اس کی تسلی نہیں ہوتی

بلکہ وہ خیال کرتا ہے کہ مبادا اس سے کوئی بات رہ گئی ہو۔اس لئے وہ دوسرے کے پاس جاتا ہے اور جب دوسرا بھی اسے وہی مضمون سناتا ہے جو پہلے نے سنایا تو اس کو کسی قدر تسلی ہوتی ہے مگر پورا اطمینان اسے پھر بھی میسر نہیں آتا۔ اور وہ تیسرے کے پاس جاتا ہے۔ پھر چوتھے اور پھر پانچویں کے پاس جاتا ہے اور اس طرح پانچ سات متفرق آدمیوں سے مختلف موقعوں پر وہ خط پڑھواتا ہے اور چونکہ ان میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ پہلے یہ کسی اَور سے خط کا مضمون سن چکا ہے اس لئے جب سب اسے خط کا ایک ہی مضمون بتاتے ہیں تو اسے اطمینان ہو جاتا ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ اب اس نے خط کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اسی طرح اگر کسی شخص کو عربی نہیں آتی تو محض اس عذر کی بناء پر وہ قرآن کریم کے پڑھنے اور اس کے مطلب کو سمجھنے سے آزاد نہیں ہو سکتا۔اس کا فرض ہے کہ وہ کسی پڑھے لکھے انسان سے قرآن سنے اور جب ایک دفعہ سن چکے تو مطمئن نہ ہو بلکہ خیال کرے کہ شاید اس نے کوئی بات غلط بتائی ہو۔اس لئے وہ دوسرے کے پاس جائے تو اس سے قرآن سنے۔پھر تیسرے کے پاس جائے اور اس سے قرآن سنے۔ پھر چوتھے کے پاس جائے اور اس سے قرآن سنے۔ یہاں تک کہ بار بار قرآن کو سننے کے بعد اسے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ اس نے خدا کے کلام کو سمجھ لیا ہے مگر اس کے علاوہ قرآن کریم میں ایک اوربات بھی ہے اوروہ یہ کہ کارڈ کا مضمون تو صرف اس وقت کے لئے ہوتا ہے اور بعد میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔مگر قرآن کریم خدا تعالیٰ کا وہ کارڈ ہے جو ایک دفعہ ہی آیا ہے اور اب دوبارہ نہیں آئے گا۔ایسے کارڈ کو سننا اور اس کے مضامین کو یاد رکھنا تو بہت ہی ضروری ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کے لئے جو قرآن کریم کے مطالب سمجھنے کی بھی توفیق رکھتے ہیں۔ ان کے لئے تو یہ آسانی ہوتی ہے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر قرآن کریم کو پڑھ سکتے ہیں جیسے مَیں درس میں شامل نہیں ہوتا۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مَیں گھر پر قرآن کریم کو پڑھ لیتا ہوں۔اور مجھے خدا تعالیٰ نے یہ توفیق دی ہے کہ مَیں اس کو سمجھ سکوں۔

پس مجھے ضرورت نہیں کہ مَیں ایسے درسوں میں شامل ہوں۔ لیکن وہ شخص جو پڑھا ہؤا نہیں اور وہ گھر میں بیٹھ کر قرآن کریم پر غور کر کے اس کے مطالب کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس کے لئے تو بہت ہی ضروری ہے کہ وہ درس میں شامل ہو۔ گو تمام پڑھے لکھے لوگ بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ قرآن کریم کو سمجھ سکیں بعض لوگ اچھے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور علوم ظاہری انہیں خوب آتے ہیں مگر ان کے اندر ایسا ملکہ نہیں ہوتا کہ وہ قرآن کریم پر غور کر سکیں۔ ایسے لوگوں کے لئے بھی باوجود عالم اور پڑھے لکھے ہونے کے ضروری ہے کہ درس میں شامل ہوں۔ پھر بعض دفعہ ایک شخص عالم قرآن تو ہوتا ہے مگر دوسرا شخص جو قرآن سنا رہا ہوتا ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ قرآن کریم کو جاننے والا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عالمِ قرآن کے لئے بھی درس میں شامل ہونا ضروری ہو گا۔ اور اگر دوسرا شخص قرآن کریم کو زیادہ جاننے والا نہ ہو اور سننے والا زیادہ عالم ہو تو اس حالت میں بھی درس میں شامل ہونا فائدہ سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ اسے بھی باوجود زیادہ علم رکھنے کے دوسرے کے درس میں بعض دفعہ ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو اس کے ذہن میں نہیں ہوتیں۔

ہمارے ایک استاد تھے مَیں نے ان کو دیکھا ہے کہ جب مَیں درس دیتا تو وہ باقاعدہ میرے درس میں شامل ہوتے لیکن اس کے مقابلہ میں میرے ایک اور استاد تھے جب کبھی وہ درس دے رہے ہوتے تو پہلے صاحب مسجد میں آکر انہیں درس دیتے ہوئے دیکھتے تو چلے جاتے۔ اور کہتے کہ اس کی باتیں کیا سُننی ہیں یہ تو سنی ہوئی ہیں مگر میرے درس میں باوجود اس کے کہ مَیں ان کا شاگرد تھا بوجہ اس کے کہ مجھ پر حُسنِ ظنی رکھتے تھے ضرور شامل ہوتے اور فرمایا کرتے تھے کہ مَیں اس کے درس میں اس لئے شامل ہوتا ہوں کہ اس کے ذریعہ قرآن کریم کے بعض نئے مطالب مجھے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے کہ بعض لوگوں پر چھوٹی عمر میں ہی ایسے علوم کھول دیئے جاتے ہیں جو دوسروں کے وہم اور گمان میں بھی

نہیں ہوتے۔ اسی مسجد میں 1907ء میں سب سے پہلی دفعہ مَیں نے پبلک تقریر کی۔ جلسہ کا موقع تھا بہت سے لوگ جمع تھے۔ حضرت خلیفۂ اول بھی موجود تھے۔ میں نے سورۂ لقمان کا دوسرا رکوع پڑھا اور پھر اس کی تفسیر بیان کی۔ میری اپنی حالت اس وقت یہ تھی کہ جب میں کھڑا ہوا تو چونکہ اس سے پہلے میں نے پبلک میں کبھی لیکچر نہیں دیا تھا اورمیری عمر بھی اس وقت صرف ۱۸ سال کی تھی۔ پھر اس وقت حضرت خلیفۂ اول بھی موجود تھے انجمن کے ممبران بھی تھے اور بہت سے اَور دوست بھی آئے ہوئے تھے اس لئے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس وقت مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے سامنے کون بیٹھا ہے اور کون نہیں۔ تقریر آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ جاری رہی۔ جب مَیں تقریر ختم کر کے بیٹھا تو مجھے یاد ہے حضرت خلیفہ اول نے کھڑے ہو کر فرمایا۔ میاں! مَیں تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ تم نے ایسی اعلیٰ تقریر کی۔ مَیں تمہیں خوش کرنے کے لئے یہ نہیں کہہ رہا مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مَیں بہت پڑھنے والا ہوں اور مَیں نے بڑی بڑی تفسیریں پڑھی ہیں مگر مَیں نے بھی آج تمہاری تقریر میں قرآن کریم کے وہ مطالب سنے ہیں جو پہلی تفسیروں میں ہی نہیں بلکہ مجھے بھی پہلے معلوم نہیں تھے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک نہ میرا مطالعہ وسیع تھا اور نہ قرآن کریم پر لمبے غور کا کوئی زمانہ گزرا تھا۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ نے میری زبان پر اس وقت ایسے معارف جاری کر دیئے جو پہلے بیان نہیں ہوئے تھے۔ تو دوسروں سے سن کر انسان کے علم میں بہت کچھ زیادتی ہوتی ہے۔ صحابۂ کرامؓ ہمیشہ آپس میں ملا کرتے اور حدیثوں میں آتا ہے کہ جب وہ اکٹھے ہوتے تو ایک دوسرے سے کہتے کہ آؤ ہم تھوڑی دیر کے لئے رسول کریم ﷺ کے زمانہ کی باتیں کریں تاکہ ہمارا ایمان تازہ ہو جائے۔3 چنانچہ جب بیٹھتے تو ایک کہتا مَیں نے رسول کریم ﷺ سے یہ بات سنی ہے اس پر دوسرے کو بھی کوئی بات یاد آ جاتی اور وہ کہتا۔ ہاں میں بھی اُس وقت موجود تھا اور رسول کریم ﷺ نے اس کے

ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا۔ پھر کوئی اور بات سناتا۔ اور دوسرے صحابہ اسے سن کر اپنے ایمان کو تازہ کرتے۔ تو مومنوں کا ایک دوسروں سے ملنا اور دینی باتوں میں حصہ لینا ایمان کی تازگی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ حضرت خلیفہ اول فرمایا کرتے تھے کہ میرے ایک استاد تھے (انہوں نے آپ کو درسی کتب نہیں پڑھائی تھیں بلکہ روحانی طور پر بزرگ سمجھ کر حضرت خلیفہ اول ان سے ملا کرتے تھے۔ اور ان کے روحانی علوم سے مستفیض ہوتے تھے) ان سے ایک دفعہ ملاقات میں کچھ وقفہ ہو گیااور تعلیم میں مشغول رہنے کی وجہ سے مَیں جلدی ان سے مل نہ سکا۔ چند دنوں کے بعد ان سے جا کر ملا تو وہ کہنے لگے۔ نور الدین۔ تم ہمیں اتنے دن ملے نہیں۔ حضرت خلیفہ اول فرماتے کہ مَیں نے کہا۔ حضور سبق کچھ زیادہ تھے ان میں مشغول رہنے کی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ وہ کہنے لگے کیا تم نے کبھی قصاب کی دکان دیکھی ہے؟ مَیں نے کہا کیوں نہیں۔ بہت دفعہ دیکھی ہے۔ انہوں نے کہا کبھی تم نے دیکھا کہ قصاب گوشت کاٹتے کاٹتے تھوڑی دیر کے بعد چھریاں آپس میں رگڑ لیتا ہے۔ آپ فرمانے لگے ہاں مَیں نے دیکھا ہے قصاب ایسا ہی کیا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا تمہیں کچھ پتہ ہے۔ قصاب ایسا کیوں کرتا ہے۔ قصاب دو چُھریوں کو آپس میں اس لئے رگڑتا ہے کہ گوشت کاٹتے کاٹتے چھری کی دھار پر چربی لگ جاتی ہے جس سے وہ کند ہو جاتی ہے اس پر قصاب اس چُھری کو دوسری چُھری سے رگڑ لیتا ہے اور وہ پھر تیز ہو جاتی ہے۔ یہ مثال دے کر وہ کہنے لگے دیکھو نور الدین ہم کو تمہاری ملاقات کا بھی اسی لئے شوق ہے۔ ہم سارا دن کئی قسم کے کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کاموں میں مشغول رہنے کی وجہ سے چُھریوں کی طرح ہماری دھار بھی کند ہو جاتی ہے۔ تم آتے ہو تو ہماری اور تمہاری چُھریاں آپس میں رگڑی جاتی ہیں اور تمہاری چُھری بھی تیز ہو جاتی ہے اور ہماری چُھری بھی تیز ہو جاتی ہے۔

پس مَیں جماعت کے دوستوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ جہاں رمضان کے روزے رکھیں وہاں گھروں میں بھی کثرت سے قرآن کریم کی تلاوت کریں اور

درس میں بھی مرد اور عورتیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شامل ہوں۔ اَن پڑھ اس سے مستثنیٰ نہیں بلکہ ان پر پڑھے ہوئے لوگوں کی نسبت زیادہ ذمہ داری ہے کیونکہ اس کے علاوہ انہیں سارا سال قرآن کریم کو سننے کا اور کوئی موقع نہیں ملتا پھر مَیں کارکنوں کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ عورتوں کے لئے درس سننے کا خاص طور پر انتظام کریں کیونکہ قرآن پڑھی ہوئی عورتیں کم ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہماری جماعت میں خدا تعالیٰ کے فضل سے ایسی عورتیں موجود ہیں جو قرآن کریم پڑھی ہوئی ہیں مگر پھر بھی مردوں کے مقابلہ میں کم ہیں اور اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے لئے خاص طور پر انتظام کیا جائے۔

پھر میں بیرونی جماعتوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ بھی اپنی اپنی جگہ درس کا انتظام کریں۔ اب تو درس دینے میں اس لحاظ سے بہت کچھ سہولت پیدا ہو چکی ہے کہ قرآن کریم کے ایک حصہ کی تفسیر ہماری طرف سے شائع ہو گئی ہے۔ پس اگر جماعتیں سارے قرآن کے درس کا انتظام نہ کر سکتی ہوں تو انہیں اس مہینہ میں تفسیر کبیر کے درس کا انتظام کرنا چاہئے۔ جنہو ں نے یہ تفسیر ابھی تک نہیں پڑھی اس ذریعہ سے وہ اس تفسیر کو سن سکیں گے اور جنہوں نے ایک دفعہ اس کو پڑھا ہوُا ہے انہیں اس ذریعہ سے اس کے مضامین دوبارہ تازہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ خالی ایک دفعہ پڑھ لینے سے کوئی چیز یاد نہیں رہتی بلکہ بار بار پڑھنے سے یاد رہتی ہے۔ مدرسوں میں ہی دیکھ لو۔ کس طرح بار بار سبق یاد کرائے جاتے ہیں اسی طرح کسی کتاب سے صحیح رنگ میں اسی وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جب اس کے مضامین یاد ہوں۔ ایک کتاب کو پڑھ کر رکھ دینا اور پھر اس سے کبھی بطور ریفرنس کام لے لینا کتاب کا صحیح استعمال نہیں کہلاتا۔ کتاب کا صحیح استعمال یہی ہوتا ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے اور اس کے مطالب کو یاد رکھا جائے اور یہ صرف دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں کے متعلق ہی ضروری نہیں ہوتا بلکہ اپنی تصنیف بھی اسی نقطۂ نگاہ کے ماتحت انسان کو پڑھنی پڑتی ہے۔ چنانچہ مَیں نے خود اس رنگ میں کئی دفعہ اس تفسیر کے بعض حصوں کو

پڑھا ہے تا کہ بعض وہ مطالب جو تفسیر لکھتے وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر کھولے گئے تھے۔ وہ میرے ذہن سے اتر نہ جائیں۔ پس جہاں پورے درس کا انتظام نہ ہو سکے وہاں تفسیر کبیر کا درس دے کر اسے اس مہینہ میں ختم کر دینا چاہئے۔

اسی طرح ان دنوں میں دوستوں کو تہجد کے لئے جگانا اور تراویح کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے مگر تراویح سے مراد وہی تراویح ہیں جو رسول کریم ﷺ سے مسنون ہیں اور جو درحقیقت تہجد کی نماز ہی ہے۔ یہ جو عشاء کے وقت تراویح پڑھی جاتی ہیں۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سست لوگوں کے لئے جاری کی تھیں۔ آپ نے دیکھا کہ بہت سے لوگ نیند کے انتظار میں بیٹھ کر گپیں مارتے رہتے ہیں اور اس طرح اپنے وقت کو لغو اور فضول باتوں میں ضائع کرتے ہیں چنانچہ آپ نے مناسب سمجھا کہ ان کو گپوں کی بجائے نماز میں مشغول کر دیا جائے۔ پس یہ تراویح سست لوگوں کے لئے جاری کی گئی تھیں۔ مگر آجکل ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ سست ہونا ہی بڑے ثواب کی بات ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تہجد پڑھنے کی عادت لوگوں کو کم ہو گئی ہے اور شروع وقت کی تراویح زیادہ پڑھی جاتی ہیں حالانکہ یہ درست نہیں۔ وہ تراویح جو رمضان میں عشاء کے بعد پڑھی جاتی ہیں مسنون نہیں ہیں بلکہ وہ قائم مقام مقرر کی گئی ہیں مسنون تراویح کی۔ اصل چیز تہجد کی نماز ہے جس کی خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں تعریف کی ہے4 اور جس پر رسول کریم ﷺ کا بھی عمل تھا۔ آپ ہمیشہ تہجد پڑھا کرتے تھے اور بعض ایام میں آپ نے تہجد کی نماز باجماعت بھی ادا کی ہے۔ 5 اسی طریق پر ان لوگوں کے لئے جو یوں تہجد سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بعض نے یہ طریق رائج کر دیا کہ تہجد کے وقت ایک امام لوگوں کو نماز پڑھا دے اور اس طرح وہ قرآن کریم سن لیا کریں مگر جو سست لوگ تھے اور اس وقت وہ شامل نہیں ہوا کرتے تھے ان کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ انتظام کر دیا کہ عشاء کے وقت وہ ایک امام کی متابعت میں تراویح پڑھ لیا کریں۔6 مگر بہرحال یہ انتظام سب کے لئے نہیں بلکہ سُستوں کے لئے ہے اور یا پھر

ان معذوروں کے لئے ہے جو پچھلی رات اٹھ نہیں سکتے مثلاً کوئی بیمار ہے یا بوڑھا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ تہجد کے وقت اس کے لئے اٹھنا مشکل ہے وہ تراویح میں شامل ہو سکتا ہے مگر ان معذروں اور بیماروں کے علاوہ جو تراویح میں شامل ہوتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے رجسٹر میں اپنی سُستی کا انگوٹھا لگا کر آتا ہے۔ ہاں جو بیمار یا معذور ہیں۔ انہیں تراویح میں شامل ہونے سے نہیں ڈرنا چاہیئے یا مثلاً بچے ہیں ان کے متعلق یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ تہجد کے لئے اٹھیں گے۔ سحری سے پندرہ بیس منٹ پہلے کھانا کھانے کے لئے تو وہ اٹھ سکتے ہیں مگر تہجد کے لئے اٹھنا ان پر گراں گزرتا ہے۔ ایسوں کے سوا باقی سب کو تہجد کی نماز میں شامل ہونا چاہیئے یا تو وہ اپنے گھر پر تہجد ادا کریں اور یا پھر اس نماز میں شامل ہوں۔ جو تہجد کے وقت باجماعت ادا کی جائے اور خصوصیت سے اپنے لئے اور تمام جماعت کے لئے دعائیں کریں۔ ہماری جماعت ایسے فتنوں میں گھری ہوئی ہے کہ اسے دعاؤں کی بہت ہی ضرورت ہے اور یوں تو مومن ہر وقت ہی دعا کرتا ہے خواہ کوئی فتنہ ہو یا نہ ہو۔ لوگوں میں مثل مشہور ہے کہ چور چوری سے جائے گا ہیرا پھیری سے نہیں جائے گا یعنی چوری کی عادت بے شک اس سے چھوٹ جائے گی مگر اِدھر اُدھر تاکتا جھانکتا ضرور رہے گا کیونکہ اس کی اسے عادت پڑ چکی ہوتی ہے۔ محبت بھی ایک قسم کی عادت ہی ہے اور جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو خواہ وہ کیسی ہی کیفیات میں سے گزرے ہیرا پھیری سے وہ نہیں جاتا۔ چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے اگر تم کسی دن تہجد نہ پڑھ سکو تو اشراق ہی پڑھ لو۔ یہ وہی ہیرا پھیری والی بات ہے یعنی محبت کے اظہار کا ایک دوسرا ذریعہ نکال لیا گیا ہے۔ اگر کسی وقت کسی وجہ سے مومن محبت کا پورا اظہار نہیں کر سکتا تو وہ اس کے لئے اظہار کا کوئی اَور موقع کسی اور صورت سے نکال لیتا ہے۔ اسی طرح مومن کو دعاؤں کی عادت پڑ جاتی ہے۔ تو اس کے دل میں یہ تڑپ رہتی ہے کہ کسی نہ کسی بہانے سے خدا تعالیٰ سے بات کرے اور اس کے لئے وہ دعاؤں کے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے۔ بعض دفعہ تو اسے کوئی حقیقی احتیاج ہوتی ہے اور

وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر دعا کرنے لگتا ہے کہ یا اللہ میری فلاں ضرورت کو پورا کر دے۔ اب اس کا یَا اَللّٰہ کہنا اپنے محبوب سے باتیں کرنا ہی ہے اور یہ ایسی ہی بات ہے جیسے چور چوری کرنے جاتا ہے مگر کبھی ایک مومن کو حقیقی ضرورت کوئی نہیں ہوتی تو اس وقت وہ اپنے لئے احتیاج تلاش کرتا ہے اور معمولی معمولی باتوں کے لئے دعاؤں میں مشغول ہو جاتا ہے اور اپنے رب سے باتیں کرنے کا بہانہ نکال لیتا ہے۔ یہ عاشق کی ہیرا پھیری ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کوئی غرض ہو یا نہ ہو، ضرورت ہو یا نہ ہو کسی طرح اپنے محبوب سے باتیں کر لوں۔ یہی محبت کا اصل مقام ہوتا ہے اور اسی محبت کے نتیجہ میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔

رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانہ کا ایک نہایت ہی دردناک واقعہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سچی محبت رکھنے والا انسان کس طرح بہانے تلاش کر کر کے اپنے جذباتِ محبت کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے۔

رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اپنی عمر کے آخری ایام میں بار بار الہام ہونے شروع ہوئے کہ اب آپ کا زمانۂ وفات نزدیک ہے۔ آپ نے مسجد میں تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور ان کے سامنے ایک تقریر کی۔ آپ نے فرمایا اے لوگو! خدا تعالیٰ کا ایک نیک بندہ تھا اسے خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو دنیا میں رہنا پسند کرے اور اگر چاہے تو خدا تعالیٰ کے پاس جانا پسند کر لے۔ اس نے دنیا میں رہنا پسند نہ کیا بلکہ یہی چاہا کہ وہ اپنے خدا کے پاس چلا جائے۔ لوگوں نے جب یہ بات سنی تو انہوں نے خیال کیا کہ رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنے وعظ میں کسی خدا کے بندے کی ایک مثال بیان فرما رہے ہیں مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب اس بات کو سنا تو وہ رو پڑے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے وہ کہتے ہیں مَیں نے حضرت ابو بکرؓ کو جب روتے ہوئے دیکھا تو مَیں نے کہا اس بڈھے کی مت ماری گئی ہے۔ رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تو ایک مثال بیان فرما رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایک بندہ تھا جس سے خدا نے یہ پوچھا کہ تو دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے یا ہمارے پاس آنا

پسند کرتا ہے اور اس نے خدا کے پاس جانا پسند کر لیا۔ یہ ایک مثال ہے جو آپ نے مومن کی بیان فرمائی ہے۔ ابو بکرؓ کو کیا ہؤا ہے کہ وہ خوامخواہ رونے لگ گئے ہیں مگر حضرت ابو بکرؓ کے آنسو بند نہ ہوئے۔ وہ اتنا روئے اتنا روئے کہ اور لوگوں نے انہیں تسلی دینی شروع کر دی مگر وہ برابر روتے چلے گئے۔ آخر رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اے لوگو سنو ہر ایک شخص کا ایک بڑا گہرا اور انتہاء درجہ کا دوست ہوتا ہے اور ابو بکر میرا ویسا ہی دوست ہے۔ پھر آپ نے فرمایا خدا میرا خلیل ہے۔ اگر خدا کے سوا کسی اور کو خلیل بنانا جائز ہوتا تو مَیں ابو بکر کو بناتا۔ مَیں حکم دیتا ہوں کہ مسجد کی ساری کھڑکیاں بند کر دی جائیں سوائے ابو بکرؓ کی کھڑکی کے۔7

یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی ایک پیشگوئی تھی۔ کیونکہ خلیفہ کو نماز پڑھانے کے لئے مسجد میں آنا پڑتا ہے۔ بعد میں رسول کریم ﷺ نے اور کئی باتیں بیان کیں یہاں تک کہ صحابہ پر بھی یہ بات منکشف ہو گئی کہ رسول کرم ﷺ کی اب جلد وفات ہونے والی ہے اسی دوران میں چند دنوں کے بعد آپ بیمار ہو گئے۔ ایک دن آپ باہر تشریف لائے مجلس میں بیٹھے اور صحابہ سے فرمایا کہ اب میری موت قریب ہے، مَیں نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مَیں مجرم کی حیثیت میں پیش ہوں۔ مجھے ہمیشہ تم سے معاملات پیش آتے رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی معاملہ میں مجھ سے غلطی ہو گئی ہو اور میرے ہاتھ سے تم میں سے کسی کو اذیت پہنچی ہو۔ اگر تم میں کوئی شخص ایسا ہے جو سمجھتا ہے کہ میں نے اس کا حق مارا ہے تو وہ آج مجھ سے اس کا بدلہ لے لے۔ صحابہؓ کو رسول کریم ﷺ سے جو عشق تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے تمہاری سمجھ میں آ سکتا ہے کہ یہ فقرہ سن کر ان کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ جس طرح ذبح کیا ہوا مرغ تڑپتا ہے اسی طرح وہ بے تاب ہو کر رونے لگ گئے۔ مگر ایک شخص کھڑا ہؤا اور کہنے لگا یَا رَسُولَ اللّٰہ! مجھے آپ سے ایک تکلیف پہنچ چکی ہے اور چونکہ آپ نے اس وقت فرمایا ہے کہ اگر کسی کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو وہ اس کا بدلہ لے لے اس لئے مَیں اپنی تکلیف کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ آپ نے

فرمایا تمہیں مجھ سے کیا تکلیف پہنچی ہے۔ اس نے کہا یا رسول اللہ فلاں جنگ کے موقع پر آپ صف بندی کرا رہے تھے کہ آپ کو ایک صف میں سے گزر کر آگے جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اُس وقت جب آپ صف کو چیر کر آگے گئے تو آپ کی کُہنی مجھے لگی تھی۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بہت اچھا تم بھی مجھے اس جگہ کُہنی مار لو۔ اس نے کہا یا رسول اللہ جس وقت مجھے آپ کی کہنی لگی تھی۔ اس وقت میرا جسم ننگا تھا اور آپ نے اس وقت کرتہ پہنا ہوُا ہے۔ اس وقت صحابہؓ کی یہ کیفیت تھی کہ ان کی آنکھوں میں سے خون ٹپکنے لگا اور اگر انہیں رسول کریم ﷺ کا خوف نہ ہوتا تو ہر شخص اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ مگر رسول کریم ﷺ نے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اپنی پیٹھ سے کرتہ اونچا کر دیا اور فرمایا لو اب کُہنی مار لو۔ وہ شخص آگے بڑھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ پھر وہ نیچے جھکا اور اس نے محبت سے رسول کریم ﷺ کی پیٹھ پر ایک بوسہ دیا اور کہنے لگا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ! اس کُہنی لگنے کے واقعہ کو تو مَیں نے محض ایک بہانہ بنایا ہے ورنہ بدلہ کیسا۔ مَیں نے سوچا کہ اب جبکہ آپ کی وفات کا وقت قریب ہے۔ مَیں آخری دفعہ آپ کا بوسہ تو لے لوں۔ پھر وہی صحابہؓ جو اسے غصہ کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے رشک کی نظروں سے دیکھنے لگ گئے اور انہوں نے چاہا کہ کاش! ہمیں بھی کہنی لگی ہوتی اور ہم بھی رسول کریم ﷺ کے بابرکت جسم کا بوسہ لے سکتے۔8

اب دیکھو یہ ایک بہانہ تھا جو اس نے بنایا اور اسی کو عاشق کی ہیرا پھیری کہتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہ اس کے دل میں رسول کریم ﷺ سے بدلہ لینے کا خیال تھا یا رسول کریم ﷺ نے اسے نَعُوْذُ بِاللّٰہِ عمداً مارا تھا۔ بدلہ تو اس فعل کا لیا جاتا ہے جو عمداً دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے سرزد ہو۔ پس نہ رسول کریم ﷺ نے اس کو کوئی نقصان پہنچایا تھا اور نہ اس صحابی کا مقصد یہ تھا کہ وہ رسول کریم ﷺ سے بدلہ لے۔ یہ محض اس نے ایک بہانہ بنایا کہ جب رسول کریم ﷺ کہتے ہیں بدلہ

لے لو۔ تو کیوں نہ مَیں بھی اسی ذریعہ سے اپنی محبت کے جذبات کا اظہار کر دوں۔ تو جس جگہ محبت ہوتی ہے وہاں بیسیوں تجاویز ذہن میں آ جاتی ہیں اور انسان اپنے محبوب کے پاس جانے اور اس سے باتیں کرنے کے لئے کئی قسم کے مواقع پیدا کر لیتا ہے۔ پس مومن دعاؤں میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا بلکہ اس محبت کی وجہ سے جو اسے خدا تعالیٰ سے ہوتی ہے وہ خدا تعالیٰ کے پاس جانے اور اس سے باتیں کرنے کے لئے ہر وقت بہانے تلاش کرتا رہتا ہے۔ مومن خود بیمار ہو یا اس کا کوئی اَور عزیز بیمار ہو تو وہ دعا کرتا ہے۔ مالی مشکلات ہوں تو دعا کرتا ہے اسی طرح کوئی اور تکلیف پیش آئے تو وہ دعا کرتا ہے لیکن اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح خدا تعالیٰ سے باتیں ہوتی رہیں۔ بچوں کو ہی دیکھ لو۔ ماں تھوڑی دیر ان کی طرف توجہ نہ کرے تو وہ منہ بسورنے لگ جاتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں بھوک لگ گئی ہے۔ ہمیں یہ چاہئے ہمیں وہ چاہئے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ماں اپنی گود میں اٹھا لے۔ پس جسے سچا عشق ہوتا ہے وہ ایسا ہی کرتا ہے اور وہ اپنے محبوب کی ملاقات کے لئے بہانے تلاش کرتا ہے۔ محبت بھی ایک بیماری ہے جو علاج چاہتی ہے اور وہ بھی ایک زخم ہے جو مرہم چاہتا ہے۔ اسی لئے انسان کبھی بیمار بن کر خدا کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے یا اللہ فضل کر اور کبھی اگر جسمانی طور پر وہ بیمار نہ ہو تو اپنی روحانی تکالیف اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس طرح ہر وقت اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر گرا رہتا ہے۔

غرض مومن بجائے اس کے کہ دعاؤں کی طرف سے مُنہ پھیرے، بہانے بنا بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا اور ہمیشہ اس کے دروازہ کو کھٹکھٹاتا رہتا ہے۔ پس دوستوں کو ان ایام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہئے۔

ڈلہوزی کے واقعہ کے متعلق حکومت کا جواب: اس کے بعد مَیں اُس واقعہ کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جسے پچھلے خطبۂ جمعہ میں مَیں نے بیان کیا تھا۔ دوستوں کی طرف سے اس بارہ میں کثرت کے ساتھ خطوط اور تاریں آئی ہیں اور

بعض نے اپنی خدمات بھی پیش کی ہیں۔ مَیں دوستوں کو بتا چکا ہوں کہ اس معاملہ میں اول اور مقدم بات مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ ہماری طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہو جو جنگ کی مساعی میں حرج پیدا کرنے والی ہو۔ پھر مَیں اس بات کی بھی کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ کسی رنگ میں جلد بازی سے کام لیا جائے۔ جیسا کہ مَیں اخبار میں شائع کرا چکا ہوں۔ گورنمنٹ کی طرف سے جواب یہ آیا ہے کہ اس معاملہ کی ڈپٹی کمشنر صاحب تحقیقات کر رہے ہیں۔ گو مَیں یہ نہیں سمجھ سکا کہ بغیر اس کے کہ ہم سے گواہ طلب کئے جائیں اور بغیر اس کے کہ ہمارے دلائل معلوم کئے جائیں ان کی تحقیقات کے معنے ہی کیا ہیں۔ اگر تو تحقیقات کے صرف اتنے معنے ہیں کہ انہوں نے پولیس والوں سے پوچھ لینا ہے کہ کیا معاملہ ہوا تو یہ تحقیقات نہیں کہلا سکتی کیونکہ پولیس کی طرف سے اس بارہ میں جھوٹی رپورٹ پہلے ہی موجود ہے۔ تحقیقات کا طریق یہ تھا کہ وہ ہم سے گواہ طلب کرتے، ہمارے دلائل معلوم کرتے اور پھر فیصلہ کرتے کہ شرارت کس کی ہے۔ ہمارے پاس خدا تعالیٰ کے فضل سے گواہ موجود ہیں بلکہ خود گورنمنٹ کے بعض افسر اس بارہ میں گواہ ہیں۔ مگر ڈپٹی کمشنر صاحب کو ان کا کیا پتہ لگ سکتا ہے جب تک ہم نہ بتائیں۔ پس مَیں نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا تحقیق کر رہے ہیں اگر ان کی تحقیق اسی رنگ کی ہوئی تو پھر ان کی تحقیقات کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ مگر پھر بھی کوئی وجہ نہیں کہ ہم جلدی کریں۔ مَیں سمجھتا ہوں جو شخص جلدی جوش میں آ جاتا ہے وہ مستقل مزاج اور قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ کام کے قابل وہی شخص ہوتا ہے جسے ایک دفعہ جب علم ہو جائے کہ فلاں بات کرنی ضروری ہے تو اگر بیس سال کے بعد بھی اسے وہ بات کرنے کے لئے کہا جائے تو اس کے دل میں ویسا ہی جوش موجود ہو جیسا بیس سال پہلے موجود تھا۔ چنانچہ دیکھ لو۔ صحابہؓ نے کس طرح مکی زندگی میں مسلسل تیرہ سال تکالیف برداشت کیں۔ مگر اس تیرہ سال کے لمبے عرصہ میں ان کے سینے ٹھنڈے نہیں ہو گئے اور نہ ان کے دلوں کے جوش سرد ہوئے۔ چنانچہ

مدینہ میں جانے کے بعد جب ان کو لڑائی کی اجازت ملی تو اس وقت بھی وہ ویسے ہی جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ جیسے مکی زندگی میں۔ تو ایمان کی علامت یہ ہوتی ہے کہ مومن کے سینہ کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ پس مَیں اس معاملہ میں جماعت کے دوستوں کو یہی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ صبر کریں اور استقلال کے دامن کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کیا ہوُا ہے کہ سات اکتوبر تک ہم گورنمنٹ کی تحقیق کا انتظار کریں گے اور اس وقت تک ہم کوئی مزید یاد دہانی کسی قسم کی نہیں کرائیں گے۔ سات اکتوبر تک اس واقعہ پر قریباً 25 دن گزر چکے ہوں گے۔ اس کے بعد اگر ضرورت محسوس ہوئی تو یاد دہانی کرائی جائے گی۔ باقی خبریں ہم کو ملتی ہی رہتی ہیں۔ اس لحاظ سے جس حد تک کام گورنمنٹ کی طرف سے ہوُا ہے اور جو کچھ وہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اس کا ایک حد تک ہمیں علم ہے۔ مگر یہ چیزیں اس قسم کی نہیں ہوتیں کہ ان کو بنیاد قرار دے کر مومن کسی امر کا فیصلہ کر دے۔ خدا کہتا ہے کہ ایک شخص اگر گناہ کرنے اور خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے کے باوجود غرغرۂ موت سے پہلے توبہ کر لے تو میں اس کے گناہ معاف کر دیتا ہوں۔ 9 تو جبکہ خدا کسی بندے کے متعلق اس وقت تک کوئی آخری فیصلہ نہیں کرتا جب تک اس کی جسمانی زندگی ختم نہ ہو جائے تو بندے کس طرح ایسا کر سکتے اور کسی کا فعل مکمل ہونے سے پہلے اسے اچھا یا بُرا کہنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ بلکہ اچھا کہنے میں تو پھر بھی کوئی حرج نہیں لیکن کسی فعل کو بُرا اس وقت تک نہیں کہا جا سکتا جب تک اس فعل کا مرتکب اپنے فعل کو مکمل نہ کر دے۔ مثلاً فرض کرو کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل کرنے کی نیت سے جا رہا ہے۔ اب جہاں تک نیت کا سوال ہے۔ ہم کہیں گے کہ وہ بری ہے مگر جہاں تک فعل کا سوال ہے ہم اس بارہ میں اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتے جب تک وہ اپنے فعل کو مکمل نہیں کر لیتا یا اس فعل سے باز نہیں آ جاتا۔ فرض کرو وہ شخص جاتا تو قتل کی نیت سے

ہی ہے مگر دوسرا شخص اسے ملتا نہیں اور وہ واپس گھر آ جاتا ہے تو ہم اسے قاتل نہیں کہیں گے یا اگر وہ تلوار لے کر دوسرے کے سر پر بھی پہنچ جاتا ہے اور پھر قتل کرنے سے پیشتر اپنے ہاتھ کو نیچے گرا دیتا ہے تو اس وقت بھی اسے ہم قاتل نہیں کہیں گے بلکہ اگر وہ تلوار سے دوسرے پر حملہ کر بھی دیتا ہے لیکن حملہ کرتے وقت اس کے دل میں خدا تعالیٰ کا خوف پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی ضرب کو کمزور کر دیتا ہے تو اس وقت بھی ہم اسے قاتل نہیں کہیں گے کیونکہ ہمارا کوئی حق نہیں کہ کسی کا فعل مکمل ہونے سے پہلے اس کے متعلق کسی آخری فیصلہ کا اظہار کریں۔ایسا وہی کرتا ہے جو جلد باز ہو اور جو سمجھتا ہو کہ اس وقت تو جوش کی حالت ہے پھر نہ معلوم جوش رہے یا نہ رہے۔ بہتر ہے کہ اسی وقت کام کر لیا جائے۔ مگر ایسے انسان کی مدد یا ہمدردی کوئی فائدہ پہنچانے والی نہیں ہوتی۔

ایک خط اور اس کا جواب: پس اس معاملہ کے متعلق تو مَیں اتنی ہی بات کہتا ہوں۔ہاں ایک اور معاملہ ہے جو اس کی شاخ کے طور پر پیدا ہوا ہے اور مَیں اس کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔وہ معاملہ یہ ہے کہ مجھے کل ایک خط موصول ہوا ہے وہ خط ایک ایسے شخص کی طرف سے ہے جو اپنے آپ کو احمدی ظاہر کرتا ہے۔اس خط پر ٹکٹ نہیں بلکہ مقامی ڈاک کے ذریعہ سے ملا ہے جس سے مَیں سمجھتا ہوں کہ کوئی مقامی آدمی اس خط کا لکھنے والا ہے۔اس خط میں اس نے بجائے اپنا نام لکھنے کے اپنے آپ کو ''مخلص احمدی'' قرار دیا ہے۔اس کے احمدی اور پھر مخلص احمدی ہونے کا تو اسی سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنا نام ہی نہیں لکھا حالانکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔میں اسی کو مومن قرار دیتا ہوں جو خدا تعالیٰ کے تازہ نشانات پر ایمان رکھتا ہو اور نِفاق کا کوئی شائبہ تک اس کے اندر نہ پایا جاتا ہو [10] مگر اس ''مخلص احمدی'' کی یہ حالت ہے کہ ڈر کے مارے اس نے اپنا نام تک ظاہر نہیں کیا۔ ایسے شخص کو ہم احمدی بھی کیونکر سمجھ سکتے ہیں کُجا یہ کہ اسے ''مخلص احمدی'' سمجھا جائے۔ پھر یہ تمام خط عجیب و غریب اضداد سے بھرا ہوا ہے۔ مجھے لکھتا ہے تم

اپنے آپ کو بڑا بہادر کہتے ہو تم بہادر نہیں بلکہ بزدل ہو۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ مَیں جس نے منبر پر کھڑے ہو کر گورنمنٹ کی غلطی بیان کر دی تھی۔ وہ تو اس کی نگاہ میں بزدل ہوُا مگر خود اس اعتراض کرنے والے کی یہ حالت ہے کہ ڈر کے مارے اس نے اپنا نام تک نہیں لکھا۔ کہتے ہیں

بر عکس نہند نام زنگی کافور

یہی اس شخص کی حالت ہے اگر وہ اپنے متعلق لکھ دیتا کہ مَیں چونکہ منافق ہوں اس لئے اپنا نام ظاہر نہیں کرتا۔ اور پھر میرے متعلق یہ لکھتا ہے کہ تم بزدل ہو تب بھی یہ بات آپس میں کسی قدر جُڑ جاتی۔ گو میرے متعلق بزدلی کا الزام پھر بھی غلط ہوتا کیونکہ مَیں نے گورنمنٹ کی غلطی کو چھپایا نہیں بلکہ علی الاعلان بیان کیا ہے مگر لطیفہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو تو وہ بہادر کہتا ہے پھر احمدی اور مخلص احمدی بننے کا دعویدار ہے اور حالت یہ ہے کہ ایسا بہادر اور مخلص احمدی خط کے نیچے اپنا نام تک لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مگر میں جس نے منبر پر کھڑے ہو کر تمام باتیں بیان کر دی تھیں اس کے نزدیک بزدل ہوں۔ گویا وہ شخص جو يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ[11] کے مطابق مخفی طور پر وسوسہ اندازی کرے اور گمنام خط لکھے وہ تو مومن اور "مخلص احمدی" ہے مگر جو منبر پر کھڑے ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کر دے وہ بزدل ہے۔ غرض پہلا لطیفہ تو اس نے یہی کیا مگر اسی ایک لطیفہ پر ہی بس نہیں۔ اس کا تمام خط اضداد سے بھرا ہوُا ہے۔ پھر بڑے غصہ سے گویا وہ گورنر صاحب کا بڑا جانثار ہے۔ مجھے لکھتا ہے تم گورنر کے متعلق کیا کہتے ہو۔ کیا گورنر تم سے زیادہ شریف نہیں۔ مگر ساتھ ہی اس نے اسی خط پر مجھے لکھا ہے "بخدمت اشرف" یعنی مَیں اس خط کے ذریعہ سب سے شریف آدمی کو مخاطب کرتا ہوں۔ گویا خط کے اوپر تو مجھے سب سے زیادہ شریف قرار دے دیا اورخط میں یہ لکھا کہ کیا گورنر صاحب تم سے زیادہ شریف نہیں ہیں۔ پھر اس نے اپنے خط میں ناظر امور عامہ کو کوسا ہے اور لکھا ہے کہ سب سے بڑا ظالم جس سے زیادہ ظلم دنیا میں کبھی

کسی پولیس نے نہیں کیا۔زین العابدین ہے جو اپنے آپ کو ولی اللہ بھی کہتا ہے۔ پھر لکھتا ہے پولیس والوں کو کوئی سزا ملے یا نہ ملے تم نے خطبہ میں یہ بات بیان کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے ذلیل کر لیا ہے۔ اگر تمہارے اندر عقل ہوتی تو تم اس بات کو چھپاتے مگر تم نے اس بات کو چھپایا نہیں بلکہ خطبہ میں بیان کر دیا ہے اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو ذلیل کر لیا ہے۔

مَیں ان باتوں میں سے جو بات اس نے ولی اللہ شاہ صاحب کے متعلق لکھی ہے اسے چھوڑتا ہوں کیونکہ اس کا جواب وہی دے سکتے ہیں۔ اس نے کوئی واقعات نہیں لکھے جن سے ان کا ظلم ثابت ہوتا۔ پس میرے لئے بھی ضروری نہیں کہ مَیں اس کا جواب دوں۔ البتہ اس نے ایک بات لکھی ہے کہ دفتر والے خطوں کا جواب نہیں دیتے۔ ممکن ہے غلطی سے کسی خط کا انہوں نے جواب نہ دیا ہو مگر اس قسم کی جب بھی میرے پاس کوئی شکایت آتی ہے۔ مَیں دفتر والوں سے باز پُرس کیا کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ خط کا جواب جلد دیا جائے اور جب مَیں دیکھتا ہوں کہ دفتر کی غلطی کی وجہ سے کسی کی بہت دل شِکنی ہوئی ہے۔ تو مَیں اپنے ہاتھ سے اسے خط لکھ کر بھیج دیتا ہوں اور ساتھ ہی معذرت کرتا ہوں کہ دفتر کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی ہے۔ ممکن ہے ولی اللہ شاہ صاحب کے متعلق بھی اسے کوئی ایسی ہی شکایت ہو مگر بہرحال اس نے چونکہ کوئی واقعہ نہیں لکھا جس سے ان کا ظلم ثابت ہوتا اس لئے اس بارہ میں مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر ان کے متعلق کوئی الزام قائم کیا جائے تو پھر میں اس کی تحقیق کرا سکتا ہوں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ نظارتوں کو میں ہمیشہ ڈانٹتا رہتا ہوں لیکن پھر بھی اگر معیّن رنگ میں ان پر کوئی الزام قائم کیا جائے تو جیسا الزام ہو گا اس کے متعلق ویسی ہی تحقیق کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر چونکہ اس نے کوئی واقعہ نہیں لکھا اس لئے اس بارہ میں مَیں کچھ نہیں کہتا۔ اگر وہ کوئی واقعات لکھے تو ان کے متعلق ولی اللہ شاہ صاحب ہی جواب دے سکتے ہیں۔ میں صرف دو باتیں لے لیتا ہوں اور انہی کا اس خطبہ کے ذریعہ

جواب دیتا ہوں۔ اس نے لکھا ہے کہ :

اول: تم نے خطبہ میں یہ باتیں بیان کر کے اپنے آپ کو ذلیل کر لیا۔

دوم: کیا گورنر تم سے زیادہ شریف نہیں۔

پہلی بات جو ہے کہ خطبہ میں اس واقعہ کو بیان کر کے مَیں نے اپنے آپ کو ذلیل کر لیا۔ یہ درحقیقت اس نے اپنے اوپر قیاس کر لیا ہے۔ دنیا میں دو قسم کے گروہ ہوتے ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہوتا ہے جس کی انسان بے عزتی کر سکتے ہیں۔ مگر دوسری قسم کا گروہ وہ ہوتا ہے جس کی انسان بے عزتی نہیں کر سکتے بلکہ اپنے خیال میں لوگ اس کی جتنی زیادہ بے عزتی کرتے ہیں اُتنی ہی زیادہ اِس کی عزت بڑھتی ہے۔

اس "مخلص احمدی" کو (ہمیں ایک شخص کے متعلق شبہ ہے کہ اس نے یہ خط لکھا ہے اور جمعہ سے پہلے مَیں نے ایک شخص کو وہ خط دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اس بارہ میں تحقیق کر کے خطبہ سے پہلے مجھے اطلاع دے۔ مگر وہ خط لے کر ہی غائب ہو گیا۔ اب وہ بے چارا اپنی تحقیق مکمل کر کے اس وقت آئے گا جب خطبہ ختم ہو جائے گا۔ حالانکہ مَیں نے اسے کہہ دیا تھا کہ اگر پتہ نہ لگے تب بھی جمعہ سے پہلے مجھے خط واپس کر دیا جائے۔ مگر خیر اس خط کو چونکہ مَیں نے دو دفعہ پڑھا ہے اس لئے اس کا مضمون مجھے اچھی طرح یاد ہے☆) مَیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر ایک نقطۂ نگاہ سے عزت کا معیار الگ ہوتا ہے جس گروہ میں وہ شامل ہوتا ہے اس گروہ میں اگر اس کی عزت ہو تو دوسرے کے نزدیک یہ ذلّت ہوتی ہے اور اگر وہاں اس کی بے عزتی ہو تو دوسرے کے نزدیک یہ عزت ہوتی ہے۔ مثلاً یہی جنگ جو اِس وقت جاری ہے۔ اس میں جو انگریز جرنیل فاتح ہوتا ہے اس کی عزت انگریزوں کے دلوں میں بہت بڑھ جاتی ہے مگر جرمن اور اٹلی والوں کے نزدیک وہ بڑا مغضوب

☆ خطبہ کے بعد تحقیق ہو گئی ہے کہ جس شخص کے متعلق مجھے شبہ تھا وہی خط لکھنے والا تھا اور اب اس نے اقرار بھی کر لیا ہے مگر اس بارہ میں مَیں الگ اعلان کروں گا۔

ہوتا ہے اور اس کو وہ گالیاں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں جرنیل بڑا خبیث ہے اس نے یہ ظلم کئے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جرمنوں میں سے جو جرنیل بہادری دکھلاتا اور انگریزوں اور ان کے ساتھیوں کو کسی مقام پر شکست دیتا ہے وہ جرمنوں میں عزت پا جاتا ہے مگر انگریزوں کی نگاہ میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روس میں جہاں جہاں جرمن فوجیں پہنچی ہیں وہاں جرمنوں کے نزدیک وہ جرنیل جو شہروں کو تباہ کر رہے ، عمارتوں کو گرا رہے، آبادیوں کو ویران کر رہے اور بڑی بڑی توپوں اور گولوں اور بموں سے ہر جگہ آگ لگاتے جا رہے ہیں وہ بہت بڑی عزت کے مالک ہیں مگر روسیوں کے نزدیک وہ لوگ جو تباہ ہو رہے ہیں جو جرمنوں کی گولیاں کھا رہے ہیں جن کی لاشوں کے میدانوں اور شہروں میں ڈھیر پڑے ہوئے ہیں وہ عزت کے مستحق ہیں۔ تو عزت اور بے عزتی کسی گروہ سے تعلق رکھنے یا نہ رکھنے کے لحاظ سے ہوتی ہے اور ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک گروہ کے نزدیک ایک چیز ذلت کا موجب ہوتی ہے مگر دوسرے کے نزدیک وہی چیز عزت کا موجب ہوتی ہے۔ یہی شروع سے دنیا کا حال چلا آیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام آئے تو شیطان نے انہیں اپنے گھر سے نکلوا دیا اور بڑی بڑی تکلیفیں دیں اور شیطان نے سمجھا کہ اس طرح میری بڑی عزت ہو گی اور آدم ذلیل ہو گا مگر آدم جس گروہ میں سے تھا اس میں اس کی عزت ان تکلیفوں سے اَور بھی بڑھ گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ چونکہ آدم نے عزم سے بدی نہیں کی تھی اور چونکہ اسے شیطان کی طرف سے تکلیف پہنچی اس لئے ہم نے اسے بڑی عزت دی۔ 12 پھر نوح علیہ السلام آئے تو انہیں بھی لوگوں نے بڑے بڑے دکھ دیئے انہیں جھوٹا بھی کہا، انہیں گالیاں بھی دیں، انہیں بُرا بھلا بھی کہا اور لوگوں کے نزدیک ان کی بڑی ذلت ہوئی۔ وہ جب دیکھتے کہ نوح کو گالیاں پڑ رہی ہیں، انہیں کافر اور کذّاب کہا جا رہا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ خدا ایسا دن کسی کو نہ دکھائے یہ تو بہت ذلیل ہوا ہے مگر نوح علیہ السلام کی یہ حالت تھی کہ ہر پتھر جو اُن پر پڑتا، ہر گالی جو انہیں دی جاتی اسے وہ

بڑی خوشی سے قبول کرتے اور کہتے اللہ اللہ خدا یہ دن ہمیں اَور بھی دکھائے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام آئے۔ انہیں دشمنوں نے گالیاں بھی دیں، انہیں جھوٹا بھی کہا، انہیں مارا پیٹا بھی گیا بلکہ دشمنوں نے انہیں گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا۔13 اب اس وقت کے دیکھنے والے یہی کہتے ہوں گے کہ کیا ہی وہ بری ماں تھی جس نے ایسا بچہ جنا اور کیسا ہی وہ بدقسمت باپ تھا جس کے ہاں ایسا لڑکا پیدا ہؤا۔ ہمارے گھر کے دروازہ پر تو صرف آرمڈ پولیس چند گھنٹے کھڑی رہی تھی مگر وہاں تو دشمنوں نے گھسیٹ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا تھا۔ اب بتاؤ کیا وہاں زیادہ ذلّت ہوئی تھی یا میری زیادہ ذلت ہوئی ہے۔ یہ نصیحت کرنے والا مجھے لکھتا ہے کہ تم نے کتنی بڑی بیوقوفی کی کہ منبر پر کھڑے ہو کر اس واقعہ کو بیان کر دیا اور وہ نادان یہ نہیں دیکھتا کہ میں نے تو صرف منبر پر کھڑے ہو کر اسے بیان کیا تھا مگر ابراہیمؑ کے واقعہ کو خدا تعالیٰ نے عرش پر بیان کیا ہے۔ پس وہی فعل جو نمرود14 اور اس کے ساتھیوں کے نزدیک ذلت کا موجب تھا خدا کے نزدیک ابراہیمؑ کی عزت کا باعث تھا۔ اسی لئے خدا نے عرش پر اس کا ذکر کیا اور کہا کہ دنیا کی نگاہ میں بے شک ابراہیمؑ ذلیل ہؤا مگر ہماری نگاہ میں وہ ذلیل نہیں ہؤا بلکہ پہلے سے کئی گنا زیادہ اس کی عزت ہمارے ہاں بڑھ گئی ہے اور اصل عزت وہی ہوتی ہے جو خدا اور رسول اور مومنوں کی نگاہ میں کسی کو حاصل ہو۔ پس جب ابراہیمؑ کو دنیا میں گالیاں دی گئیں تو خدا تعالیٰ کے نزدیک ابراہیم کی عزت اور بھی بڑھ گئی اور یہاں عرش پر ابراہیمؑ کا پہلے نام لکھا تھا۔ خدا نے اس نام کو مٹا کر فرشتوں سے کہا کہ ابراہیم کا نام اور اوپر لکھو۔ پھر جب انہیں گھسیٹ کر آگ میں ڈالا گیا تو خدا تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے پھر کہا کہ یہاں سے بھی ابراہیمؑ کا نام مٹاؤ اور اوپر لکھو۔ پس منبر پر اس واقعہ کو بیان کرنے سے میری کہاں ذلت ہوئی۔ جب خدا نے ابراہیمؑ کے واقعات کو عرش پر بیان کیا بلکہ قرآن میں ان کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ انہیں یہ یہ ماریں پڑی تھیں اور یہ یہ گالیاں دی گئی تھیں۔

پھر موسیٰ علیہ السلام آئے اُس وقت کیا کیا طعنے تھے جو فرعون15 نے انہیں دیئے۔ اور کس طرح اس نے آپ کو اپنی طرف سے ذلیل کیا۔ قرآن میں لکھا ہے فرعون نے انہیں طعنے دیئے اور کہا کہ تُو ہماری روٹی کھاتا رہا، ہمارے دیئے ہوئے کپڑے پہنتا رہا، ہم نے تجھے پالا پوسا اور بڑا کیا اب تُو ہمارا ہی نمک خوار ہو کر ہمارے سامنے باتیں کرتا ہے۔ کتنی تذلیل ہے جو دنیا کی نگاہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہوئی کہ جس کے گھر وہ پلے تھے، جس کے مکان میں وہ رہے تھے، جس کے دیئے ہوئے کپڑوں کو وہ پہنتے رہے تھے اور جس کی دی ہوئی روٹی وہ کھاتے رہے تھے وہی انہیں کہتا ہے کہ کیا تجھے شرم نہیں آتی۔ اب تُو ہمارے سامنے ہی باتیں کرتا ہے مگر پھر خدا نے ان باتوں کو چھپایا تو نہیں بلکہ اس نے مزے لے لے کر عرش پر ان کو بیان کیا اور اپنے فرشتوں میں ان کا ذکر کیا۔ کیا اس لئے کہ موسیٰ کی بے عزتی ہو یا اس لئے کہ فرعون کی گالیاں موسیٰؑ کی عزت کا موجب تھیں۔ یقیناً خدا نے اسے عرش پر ان باتوں کو اسی لئے بیان کیا کہ فرعون کی گالیوں میں خدا تعالیٰ کے نزدیک موسیٰؑ کی ذلت نہیں بلکہ عزت تھی کیونکہ موسیٰؑ فرعون کی بادشاہت میں نہیں رہتے تھے بلکہ خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں رہتے تھے۔ فرعون جس قدر موسیٰؑ کی تذلیل کی کوشش کرتا اسی قدر موسیٰؑ کی عزت بڑھتی اور خدا تعالیٰ خوش ہوتا۔ اسی لئے مومنوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان باتوں کو بار بار بیان کریں چنانچہ اب رمضان میں جب تم قرآن کریم کی تلاوت کرو گے تو اس میں بار بار یہی باتیں آئیں گی کہ فرعون نے موسیٰؑ کو یوں گالیاں دیں اور یوں بُرا بھلا کہا۔ اسی طرح تم نمازوں میں ان آیات کو بار بار پڑھو گے مگر اس لئے نہیں کہ موسیٰؑ کی بے عزتی ہو بلکہ اس لئے کہ موسیٰؑ کی عزت بڑھے کیونکہ دشمنوں کی گالیاں گو دنیا کی نگاہ میں ذلت کا موجب ہوں مگر خدا تعالیٰ کے نزدیک عزت کا موجب ہوتی ہیں۔

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے۔ ان کی کتاب انجیل کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہودیوں نے ان کے مُنہ پر تھوکا۔16 اُن کے سر پر کانٹوں کا تاج بنا کر

رکھا۔17 انہیں گالیاں دیں۔ انہیں مارا پیٹا گیا 18 اور پھر صلیب پر اُنہیں لٹکا دیا۔ میرا خطبہ تو کہاں تک شائع ہو گا۔ انجیل وہ کتاب ہے جو ہر سال دس کروڑ کی تعداد میں شائع ہوتی ہے۔ اب اللہ ہی جانتا ہے کہ اِس وقت تک کتنے ارب دفعہ یہ واقعات دنیا کے سامنے بیان ہو چکے ہیں کہ لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کے منہ پر تُھوکا، ان کے سر پر کانٹوں کا تاج بنا کر رکھا، ان کے جسم میں برچھیاں ماریں یہاں تک کہ خدا تعالیٰ نے یہودیوں کے اس جھوٹے الزام کو بھی نہیں چھپایا کہ عیسیٰؑ کی ماں (نعوذ باللہ) فاسقہ، فاجرہ اور بدکار تھی اور حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ناجائز تھی۔

پھر رسول کریم ﷺ آئے تو آپ کو بھی دشمنوں نے بڑی بڑی تکلیفیں دیں۔ ایک دفعہ ایک کافر نے آپ کے گلے میں پٹکا ڈال کر اس زور کے ساتھ کھینچا کہ آپ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور آپ کا دم رکنے لگا۔19 ایک دفعہ آپ سجدہ میں تھے کہ کفار نے آپ پر غلاظت ڈال دی20 مگر ان واقعات کو نہ رسول کریم ﷺ نے چھپایا اور نہ مسلمانوں نے بلکہ انہوں نے ان واقعات کو بیان کیا اور بار بار بیان کیا یہاں تک کہ بخاری اور مسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں مسلمانوں نے ان باتوں کو نقل کیا اور لوگ ہمیشہ انہیں پڑھتے رہتے ہیں۔ پھر قرآن نے بھی ان باتوں کو چھپایا نہیں بلکہ وہ بھی بار بار کہتا ہے کہ یہ کافر تجھے ساحر کہتے ہیں، تجھے کذّاب کہتے ہیں، تجھے متقنّی کہتے ہیں، تجھے مفتری کہتے ہیں۔ کیا دشمنوں کی یہ ذلیل حرکات زیادہ ہیں یا وہ واقعات زیادہ سخت ہیں جو میرے ساتھ پیش آئے۔ مَیں نے تو صرف یہ بیان کیا تھا کہ ایک موقع پر ان سپاہیوں نے مجھے کہا کہ "انہاں دا کی اعتبار ہے جو چاہن گل بنا لین" یعنی ان کا کیا اعتبار رہے جو جی چاہے گا ہمارے خلاف بات بنا لیں گے مگر قرآن تو اس سے بہت زیادہ سخت کفار کے الفاظ نقل کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ان کفار نے کہا کہ رسول کریم ﷺ (نعوذ باللہ) کذّاب ہیں، مفتری ہیں، فریبی ہیں، ساحر ہیں۔ اب کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اس ایک فقرہ سے تو ہماری ہتک ہو گئی مگر محمد ﷺ کو مفتری اور کذاب کہے جانے سے ان کی ہتک نہ ہوئی۔

بلکہ خدا نے ان کو اپنی آخری کتاب میں جو قیامت تک بار بار پڑھی جانے والی ہے نقل کر دیا اور اس طرح ان گالیوں کو چھپایا نہیں بلکہ سب کے سامنے ان کو رکھ دیا۔ پس اس "مخلص احمدی" کو یاد رہے کہ ہمارا قبیلہ بڑا سخت جان ہے۔ ہمیں گالیاں تریاق ہو کر لگا کرتی ہیں۔ البتہ جس خاندان کا وہ آدمی ہے اسے گالیاں بہت بُری معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ گالیاں ابو جہل اور یزید وغیرہ کو تو بُرا لگا کرتی تھیں مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو بُری نہیں لگتی تھیں۔ بس ہمارا خاندان ان گالیوں کو چھپاتا نہیں اور نہ ہی اسے بُری لگتی ہیں بلکہ ہمیں جتنی زیادہ گالیاں دی جائیں اتنی ہی زیادہ خدا تعالیٰ کے حضور ہماری عزت بڑھتی اور اس کے رجسٹر میں ہمارا نام زیادہ اعزاز کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ ہتک اس کی ہے جو ہمارے ساتھ ٹکراتا ہے اور ذلت اس کی ہے جو ہمارے مقابلہ میں بدگوئی اختیار کرتا ہے۔ پس اس میں ہماری ہتک کا کوئی سوال نہیں البتہ وہ شخص جو ہمارے ساتھ ٹکرائے گا وہ اپنی ہتک آپ کرے گا ورنہ ہماری تو دنیا کے سارے بادشاہ مل کر بھی ہتک نہیں کر سکتے۔ جس طرح ربڑ کا گیند جب زمین پر پھینکا جاتا ہے تو وہ اور زیادہ اچھلتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کے بندوں کو جب برا بھلا کہا جاتا ہے تو ان کی عزت پہلے سے بڑھ جاتی ہے اور اگر ان کی کوئی ہتک کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ چنانچہ دیکھ لو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لوگوں نے اپنے خیال میں جو ہتک کی اسے خدا نے ہتک قرار نہیں دیا۔ اگر ہتک قرار دیتا تو قرآن کریم میں ان واقعات کا ذکر کیوں کرتا۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنہوں نے اپنے خیال میں ہتک کی اسے خدا نے ہتک نہیں سمجھا حالانکہ اس واقعہ سے بیسیوں گُنا زیادہ ذلّت پہنچانے کی وہاں کوشش کی گئی تھی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ہی دیکھ لو آپ پر پتھر بھی پڑے، آپ کو گالیاں بھی دی گئیں، آپ کے خلاف بد زبانی بھی کی گئی، آپ کے خلاف مقدمات بھی کئے گئے اور آپ کے خلاف بڑے بڑے اشتہار، رسائل اور کتابیں بھی لکھی گئیں۔ مگر آپ نے ان باتوں کو چھپایا نہیں بلکہ سب باتیں اپنی کتابوں میں بیان

کر دیں یہانتک کہ آپ نے "کتاب البریہ" میں وہ تمام گالیاں بھی جمع کر دیں جو رسول کریم ﷺ کو ہندوؤں، عیسائیوں اور سکھوں کی طرف سے دی گئی تھیں۔اسی طرح آپ نے ان گالیوں کو بھی جمع کر دیا جو ہندوؤں عیسائیوں اور عام مسلمانوں کی طرف سے آپ کو دی گئی تھیں۔اس وقت اسی قسم کے بعض "مخلص" غیر احمدیوں نے آپ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا محض اس بناء پر کہ حضرت مرزا صاحب نے عیسائیوں ہندوؤں اور سکھوں کی ان گالیوں کو نقل کیوں کیا جو رسول کریم ﷺ کو دی گئی تھیں۔ انہیں تو چاہیئے تھا کہ ان گالیوں کو چھپاتے۔ ان نادانوں نے یہ نہ سمجھا کہ رسول کریم ﷺ کے متعلق مخالفین کی گالیاں جمع کرنے سے آپ کی عزت بڑھتی ہے گھٹتی نہیں کیونکہ عزت وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملے۔ مجھ سے کئی دفعہ انگریز افسروں نے خواہش کی ہے کہ اگر آپ پسند کریں تو حکومت سے آپ کو کوئی خطاب دلوا دیا جائے۔ مگر مَیں نے ہمیشہ انہیں یہی کہا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے خطاب ملا ہوا ہے۔ وہی میرے لئے کافی ہے۔اس کے سوا مجھے کسی خطاب کی ضرورت نہیں۔ اگر مَیں گورنمنٹ کے خطابات کو اپنے لئے عزت کا موجب سمجھتا تو اس قسم کی پیشکش کو کیوں ٹھکرا دیتا۔ میرا ایسا کرنا بتلاتا ہے کہ مَیں گورنمنٹ کی دی ہوئی کسی عزت کو اپنے لئے عزت نہیں سمجھتا بلکہ مَیں تو سمجھتا ہوں جس طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے لکھا ہے۔ تُرک حرمین کے محافظ نہیں بلکہ حرمین ترکوں کے محافظ ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے گو ظاہر میں جماعت احمدیہ کی حفاظت کا کام انگریزوں کے سپرد کیا ہوا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کے محافظ ہیں اور ہماری خاطر ہی خدا تعالیٰ ان سے نرمی کا معاملہ کر رہا ہے۔ مگر کہتے ہیں ع

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

ہر شخص کی ہمت اور استعداد کے مطابق اس کے فکر کی بلندی ہوتی ہے۔ یہ نادان بھی سمجھتا ہے کہ انگریزوں کی پولیس چونکہ اس دن ہماری کوٹھی میں گھس آئی تھی اور کئی گھنٹے تک ہمارے دروازہ پر کھڑی رہی۔ اس لئے اس واقعہ سے ہماری ہتک ہو گئی

حالانکہ ہماری ہتک صرف خدا تعالیٰ کی ناراضگی سے ہوتی ہے اَور کسی چیز سے نہیں ہوتی بلکہ اس قسم کے واقعات سے ہماری عزت خدا تعالیٰ کے حضور بڑھتی ہے۔ پھر اگر یہ ہتک ہے تو ہم سے بڑھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہتک ہوئی ہے کیونکہ ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں کیل گاڑے گئے تھے اور انہیں بھی دشمنوں نے صلیب پر لٹکا دیا تھا۔ مگر پھر خدا نے اس بات کو چھپایا تو نہیں بلکہ اس نے اپنی کتاب میں اس کو بیان کیا۔ پس ہماری ہتک کا کوئی سوال نہیں۔ ہمارا قبیلہ بہت سخت جان ہے البتہ جس قبیلہ سے وہ تعلق رکھتا ہے وہ یہ سمجھا کرتا ہے کہ اگر نمبردار بول پڑا تو ہتک ہو جائے گی، تھانیدار بول پڑا تو ہتک ہو جائے گی۔ ڈپٹی کمشنر بول پڑا تو ہتک ہو جائے گی مگر ہمارے لئے یہ باتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں اور نہ ہم ان کی عزت کی کوئی پرواہ کرتے ہیں۔ ہماری عزت وہی ہے جو ہمیں خدا تعالیٰ کے دربار میں حاصل ہے اور ہماری بے عزتی بھی اگر ہو سکتی ہے تو خدا تعالیٰ کی ناراضگی سے ہی۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات ہماری ہتک کا موجب نہیں ہو سکتی۔

باقی رہا اس کا ایک طرف مجھے اشرف کہنا اور دوسری طرف یہ لکھنا کہ کیا گورنر تم سے زیادہ شریف نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ شرافت بھی ایک نسبتی چیز ہے اور ہر قوم کے نزدیک شرافت کا الگ الگ معیار ہوا کرتا ہے۔ انگریزوں کے نزدیک بڑا اشرف وہ ہے جو نہایت معزز انگریز ہو۔ مگر وہ معزز انگریز فرانسیسیوں کے نزدیک اشرف نہیں ہو سکتا۔ بلکہ فرانسیسیوں کے نزدیک اشرف وہ ہوگا جو نہایت معزز فرانسیسی ہو۔ پھر وہ معزز فرانسیسی بے شک فرانسیسیوں کی نگاہ میں اشرف ہو گا مگر جرمنوں کے نزدیک اشرف نہیں ہو گا۔ بلکہ جرمنوں کے نزدیک اشرف وہ ہو گا جو نہایت معزز جرمن ہو۔ دور کیوں جاتے ہو اپنی اپنی قوموں کو ہی دیکھ لو کہ ایک قوم کے نزدیک ایک اشرف ہوتا ہے تو دوسری قوم کے نزدیک دوسرا۔ ایک کشمیری عورت تھی اور اس کی ایک جوان لڑکی تھی۔ اس لڑکی کی شادی کا سوال پیدا ہوا تو اس نے مجھے کہا کہ آپ اس کے لئے کوئی رشتہ تلاش کر دیں۔

ہماری جماعت کے ایک احمدی دوست جو غالباً سید تھے یا کسی اور معروف قوم سے تعلق رکھتے تھے مجھے اب صحیح طور پر یاد نہیں رہا۔ مَیں نے ان کے متعلق وہاں تحریک کی تو اس لڑکی کی والدہ اپنے دانتوں تلے انگلی دبا کر کہنے لگی۔ "ساڈے لئی ایسی کمینی ذاتاں ہی رہ گیاں ہن" یعنی ہمارے لئے کیا اب ایسی ہی کمینہ ذاتیں رہ گئی ہیں۔ گویا اس کے نزدیک یہ اس کی شدید ترین ہتک تھی کہ وہ اپنی لڑکی کسی سید سے بیاہ دے۔

اسی طرح ایک اور نوجوان دوست ایک دفعہ میرے پاس آئے وہ اب فوت ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ کہنے لگے کہ میری ایک ہمشیرہ ہیں اس کے رشتہ کا آپ کہیں انتظام کر دیں اور یہ معاملہ کلیۃً اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ میرے والد صاحب کی بھی یہی خواہش ہے کہ اس کا رشتہ آپ کے ذریعہ ہو۔ مَیں نے کہا۔ رشتہ کے متعلق آپ کی کوئی شرط ہو تو مجھے بتا دیں۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ کو کوئی اعتراض پیدا ہو۔ کہنے لگے قومیت کی کوئی شرط نہیں کسی شریف قوم کا نوجوان ہو۔ مَیں نے کہا شریف کا جو مطلب مَیں سمجھتا ہوں ممکن ہے وہ مطلب آپ نہ سمجھتے ہوں۔ اس لئے بہتر ہے کہ اس کی بھی تشریح کر دی جائے۔ کہنے لگے۔ شریف سے مراد وہی لوگ ہیں جنہیں عرف عام میں شریف سمجھا جاتا ہے۔ یہ کوئی شرط نہیں کہ فلاں قوم میں سے ہو اور فلاں قوم میں سے نہ ہو۔ مَیں نے کہا ہمارے ملک میں دو قسم کے لوگ شرفاء کہلاتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو باہر سے آئے ہوئے ہیں جیسے سیّد ہیں، مغل ہیں، پٹھان ہیں، قریشی ہیں اور ایک وہ ہیں جو پہلے ہی یہاں رہتے تھے جیسے براہمن یا راجپوت وغیرہ ہیں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا اگر ان قوموں میں سے کسی قوم کا رشتہ آپ کو مل جائے۔ وہ کہنے لگے بالکل نہیں۔ کوئی ہو مغل ہو، پٹھان ہو، قریشی ہو، برہمن ہو، راجپوت ہو۔ مَیں نے اس پر پھر اپنی بات کو دہرایا اور کہا کہ آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ عُرفِ عام میں

شریف قومیں باہر سے آنے والوں میں سے تو سید ہیں، مغل ہیں، پٹھان ہیں، قریشی ہیں اور اس ملک کے باشندوں میں سے براہمن یا راجپوت ہیں۔ جن میں جاٹ بھی شامل ہیں وہ کہنے لگے بالکل درست ہے۔ کوئی ہو مغل ہو، پٹھان ہو، قریشی ہو، براہمن ہو، راجپوت ہو۔ مجھے اس پر خیال آیا کہ مَیں نے دو دفعہ ان کے سامنے اپنی بات کو دہرایا ہے اور دونوں دفعہ ہی جواب میں یہ سیّدوں کو چھوڑ گئے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ چنانچہ مَیں نے ان سے کہا کہ مَیں نے آپ کے سامنے دو دفعہ اپنی بات دہرائی ہے اور دونوں دفعہ جواب دیتے ہوئے آپ سیّدوں کو چھوڑ گئے ہیں۔ آیا یہ اتفاق کی بات ہے یا جان بوجھ کر آپ نے ان کا نام نہیں لیا؟ اس پر وہ ہنس کر کہنے لگے مَیں نے جان بوجھ کر ان کا نام نہیں لیا۔ کیونکہ ہمارے علاقہ میں سیّدوں کو ذلیل سمجھا جاتا ہے اور عام طور پر لوگ انہیں فقیر سمجھتے ہیں۔ اب بتاؤ شریف ہونے کا کوئی ایک معیار کس طرح مقرر کیا جا سکتا ہے۔ پس اگر شرافت قومی مراد ہے اور یہ اعتراض کرنے والا اگر انگریز زادہ ہے تو اس کے نزدیک انگریز ہی اشرف ہوں گے۔ اگر ہندوستانی ہے تو ہندوستانی اور اگر جرمن یا فرانسیسی ہے تو جرمن یا فرانسیسی۔ مگر ہمارے قرآن نے قومیت کو شرافت کا معیار نہیں مقرر کیا بلکہ تقویٰ کو شرافت کا معیار مقرر کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ [21] یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو بڑا مومن ہو گا وہی سب سے زیادہ شریف ہو گا۔ اس نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو پھر اس خط کے لکھنے والے کو اس امر کا فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کیا عیسائی زیادہ عقائد صحیحہ اور اسلامی اصول پر قائم ہیں یا احمدی۔ اگر اس کے نزدیک عیسائی اسلام کے بتائے ہوئے اصول تقویٰ پر قائم ہیں تو اس کے عقیدہ کے مطابق وہی زیادہ شریف ہوں گے لیکن اگر ہم عقائد صحیحہ پر نسبتاً زیادہ قائم ہیں تو ہم عیسائیوں کی نسبت زیادہ شریف ہوں گے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ وہ ہمیں دینی لحاظ سے عقائد صحیحہ پر کامل طور پر قائم سمجھے۔ مَیں صرف یہ کہتا ہوں

کہ اگر احمدیت کی سچائی پر اس کا ایمان ہے اور وہ نسبتی طور پر عیسائیوں کی نسبت مجھے عقائد صحیحہ پر زیادہ قائم سمجھتا ہو۔ چاہے یوں وہ مجھے کتنا ہی بُرا اور گندا خیال کرتا ہو تو بہرحال عیسائیوں کی نسبت اسے مجھے اتقیٰ قرار دینا پڑے گا اور قرآنی فیصلہ کے مطابق اکرم بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے نزدیک مجھ میں بعض غلطیاں ہیں۔ پس میں اس بات کا فیصلہ اسی پر چھوڑتا ہوں۔ اگر اس کے نزدیک قرآن کریم کی بات صحیح ہے تو جس میں وہ بات زیادہ پائی جائے گی جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے مسلمانوں کے نزدیک وہی زیادہ شریف ہو گا۔ اگر عیسائیوں میں پائی جاتی ہو گی تو وہ زیادہ شریف ہوں گے اور اگر مجھ میں پائی جاتی ہو گی تو میں زیادہ شریف ہوں گا۔ہاں عیسائیوں کے عقیدہ کی رُو سے ایک عیسائی زیادہ شریف ہو گا اور اس کے مقابل پر ایک مسلمان خواہ کیسا ہی اسلام کا پابند ہو کم شریف ہو گا۔ پس اس کی ان دو باتوں کا جواب مَیں نے دے دیا ہے۔ باقی باتوں کا مَیں جواب نہیں دے سکتا۔ اگر وہ واقعات لکھتا اور بتاتا کہ فلاں فلاں پر ناظر امور عامہ کی طرف سے یہ ظلم ہؤا ہے تو مَیں ان کے متعلق تحقیق کرتا مگر چونکہ اس نے کوئی واقعات بیان نہیں کئے اس لئے اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ باقی جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے اس کا خط اضداد سے بھرا ہؤا ہے۔ ایک طرف وہ مجھے "بخدمت اشرف" لکھتا ہے اور دوسری طرف مجھے ذلیل قرار دیتا ہے۔ اسی طرح ایک طرف وہ اپنے آپ کو "مخلص احمدی" اور بڑا بہادر قرار دیتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنا نام تک ڈر کے مارے ظاہر نہیں کر سکتا۔ مَیں نے بتایا ہے کہ اس خط کے متعلق ہمیں بعض شبہات ہیں اور ایک شخص کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ اس نے یہ خط لکھا ہے۔ مگر ابھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ ☆

☆ اس خطبہ کے بعد یقینی طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ وہی شخص ہے جس کے بارہ میں مجھے شبہ تھا اور اس نے اقرار کر لیا ہے۔

البتہ اس قدر بات بالکل واضح ہے کہ یہ کسی منافق کا لکھا ہوا خط ہے اور قادیان میں اس قسم کے بعض منافق پائے جاتے ہیں۔ ہمیں ان کا اچھی طرح علم ہے۔ ہم ان کی پارٹیوں کو جانتے ہیں۔ ہمیں ان مجلسوں کا علم ہے جہاں وہ بیٹھتے ہیں مگر ہم رحم کی وجہ سے گرفت نہیں کرتے اور خیال کرتے ہیں کہ شاید ان کی اصلاح ہو جائے لیکن وہ ہمارے رحم سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ رحم بھی ایک حد تک ہی ہوتا ہے اور کوئی وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب اس قسم کے آدمی پکڑے جاتے ہیں اور انہیں اپنے کئے کی سزا بُھگتنی پڑتی ہے۔"

(الفضل 26 ستمبر 1941ء)

---

1 البقرہ: 186

2 بخاری کتاب الصوم باب اجود ماکان النبی ﷺ یکون فی رمضان

3 بخاری کتاب الایمان باب قول النبی ﷺ بنی الاسلام علیٰ خمس (الخ)

4 بنی اسرائیل: 80، الذاریات: 18، اِنَّ لَکَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (المزمل: 7)

5،6 بخاری کتاب الصوم باب فضل من قام رمضان

7 بخاری کتاب المناقب باب قول النبی ﷺ سدّوا الابواب الا باب ابی بکر

8 سیرت ابن ہشام جلد 2 صفحہ 17 مطبوعہ مصر 1295ھ

9 ابن ماجہ کتاب الزھد باب ذکر التوبۃ

10 الحکم 24 جنوری 1906ء صفحہ 5، البدر 27 فروری 1903ء صفحہ 46

11 الناس: 6

12 وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ: 116)۔ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ (طٰہٰ: 123)

13 الانبیاء: 69، العنکبوت: 25، الصافات: 98

14 نمرود: بابل کا ایک بادشاہ۔ 4000 سال قبل مسیح۔ (اردو انسائیکلو پیڈیا۔ اخبار الطوال)

15 حضرت موسیٰ کے پرورش کرنے والے فرعون کا نام رعمسیس اور مقابلہ میں آنے والے فرعون کا نام منفتاح تھا۔

16 متی باب 27 آیت 30

17 متی باب 27 آیت 29

18 یوحنا باب 19 آیت 1و3

19 بخاری کتاب المناقب باب لَوْكُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا (الخ)

20 بخاری کتاب الصَّلٰوة باب الْمَرْأَةِ تَطْرَحُ عَنِ الْمُصَلّٰى شَيْئًا مِّنَ الْاَذٰى

21 الحجرات: 14